باب دوم

مقصد فراموشی اور اس کے نتائج

اصول و مقاصد کی اہمیت

کسی خاص اور اہم مقصد کی علمبردار جماعت کی زندگی اس بات پر موقوف ہے کہ اس کی نگاہ اپنے مقصد اور نصب العین پر اچھی طرح جمی رہے اور مقصد و نصب العین پر نگاہ کا جما رہنا اس بات پر موقوف ہے کہ اس مقصد تک پہنچنے کے جو اصول ہیں انھیں یہ جماعت دل و جان سے عزیز رکھتی ہو۔ اگر اس کے افراد میں اپنے مقصد کا گہرا عشق، اور اپنے اصول کا گہرا یقین موجود ہو تو موت اس کو آنکھیں نہیں دکھا سکتی۔ یہ عشق و یقین اس بات کی ضمانت ہے کہ اس جماعت سے عزت و اقبال منہ نہیں موڑ سکتے۔ اور پھر اسی عشق و یقین کا یہ لازمی اور فطری تقاضا ہے کہ جماعت کا اجتماعی نظم و نسق اس کے اپنے ہاتھوں میں ہو۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی ایسا اجتماعی نظم اس پر مسلط ہو جو اس کے محبوب اصولوں پر تعمیر نہ کیا گیا ہو اور اگر سوئے اتفاق سے اس پر کبھی ایسے دن آ ہی پڑے تو اس کا ایک ایک فرد اس مچھلی کی طرح بے قرار ہو رہے گا جس کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا گیا ہو۔ اور اپنے مقصد، اپنے اصول اور اپنے نظام حیات کی محبت اسے موت کی بازی کھیلنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ رائج الوقت نظام کے خلاف سراپا اضطراب بن جائے گا۔ اور اس کے ساتھ کسی قسم کے اختیاری تعاون یا مداہنت کا تصور تک اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا کیونکہ وہ جانتا ہوگا کہ میری انفرادی اور جماعتی زندگی کا تشخص جن اصولوں سے قائم ہے ان کا اسی نظامِ قاہر نے گلا گھونٹ رکھا ہے۔ یہ اضطراب سکون سے اسی وقت بدل سکے گا جب کہ وہ اس نظام غیر کی دھجیاں بکھیر چکا ہوگا۔

اس کے بخلاف اگر کسی جماعت کے اندر اپنے اصولوں کا یقین مرجھا گیا اور اپنے

مقصد و نصب العین کا عشق بے جان ہو گیا ہو تو یہ اس کے مٹ جانے کی نا قابلِ انکار علامت ہے۔ اس کم یقینی اور سرد مہری کے نتیجے میں اگر اس کے اندر کسی دوسرے نظام کے ساتھ تعاون اور مداہنت کا رجحان ابھر آئے تو اس پر ہرگز کوئی تعجب نہ کرنا چاہیے اور کسی ایسے رجحان کا ابھر آنا اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا کہ حیات ملی کے محافظوں نے خزانے کی کنجیاں دشمنوں کے حوالے کر دیں۔ اور اب اس پونجی کا لٹ جانا بس کوئی دن کی بات ہے جسے کوئی معجزہ ہی روک سکتا ہو تو روک سکے۔ پھر چونکہ زوال ہو یا کمال اس دنیا میں کسی کی فطرت میں ٹھیراؤ نہیں ہے۔ اس لیے اس کے یقین و عشق میں اس زوال کا عمل اپنی رفتار سے برابر آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اور آخر کار ایک مقام پر پہنچ کر وہ اس لٹی ہوئی پونجی کے لٹ جانے کے احساس کو بھی لوٹ لیتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب افرادِ جماعت میں کسی دوسرے اصول و نظام زندگی کی غلامی کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ جب وہ تعاون اور مداہنت کی بھی حدیں پھاند چکے ہوتے ہیں۔ جب انھیں اپنا اصولی اور اخلاقی موقف ہی نہیں یاد رہ جاتا۔ جب وہ اپنے مقصد اور اصول سے اتنے بیگانہ ہو جاتے ہیں کہ ان کا عملی رویہ تو ان چیزوں کے غلط اور نا قابل قبول ہونے کی گواہی دینے ہی لگتا ہے ان کو نظری طور پر بھی یہ گوارا نہیں رہ جاتا کہ معاشرے اور مملکت کی باگ ڈور پھر سے ان اصولوں کے ہاتھ میں دے دیے جانے کی کوئی جدوجہد کی جائے، اور اگر کسی گوشے سے اس طرح کی کوئی پکار بلند ہو جاتی ہے تو وہ اسے حیرت کے کانوں سے سنتے اور اختلاف و عناد کی زبانوں سے اس کا جواب دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر جماعت بحیثیت ایک اصولی جماعت ہونے کے فنا ہو جاتی ہے اور اس کے نالائق فرزند اپنے ہی ہاتھوں اسے قبر کی گہرائیوں میں سُلا دیتے ہیں۔

ان دونوں مورخر الذکر صورتوں میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جماعت مادی حیثیت سے بھی بے نام و نمود ہو جائے اور دنیا کی دولت اور سیاست میں اس کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہ جائے۔ اس کے برعکس یہ عین ممکن ہے کہ عام مادی تدبیروں پر عمل کر کے وہ اقوام عالم کی

صفوں میں ایک نمایاں اور عظیم الشان پوزیشن کی مالک ہو جائے۔ اس کے پاس حکومت کا کروفر ہو' دولت کی شان وشوکت ہو' قومی اقتدار اور بین الاقوامی وقار ہو۔ لیکن اپنی ان تمام شوکتوں اور عظمتوں کے باوجود اس مقصد اور ان اصولوں کے نقطۂ نظر سے' جن پر اس جماعت کی بنیاد قائم تھی اس کا وجود وعدم برابر ہوگا۔ جن اصولوں کی لاش ان کے پیروں تلے روندی جا رہی ہو ان کو اس سے کیا بحث کہ وہ ذلت کی خاک پر ہے یا عظمت کے آسمان پر۔ ان کو اگر بحث ہے تو صرف اس بات سے کہ زندگی کے میدان میں ہمیں غالب و کارفرما بنانے کی اس کے افراد کے دلوں میں کتنی لگن ہے؟ اور وہ اس کے لیے اپنی جان' اپنے مال' اپنے ذرائع اور اپنی قوتوں کی کتنی قربانیاں دے رہے ہیں؟ لیکن اگر یہ کچھ نہیں ہے تو اپنی زبان حال سے یہ اصول ان سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دیں گے۔ اور پھر انصاف و دیانت کا کھلا تقاضا ہوگا کہ یہ لوگ بھی اپنی طرف سے اس اعلان کے برحق ہونے کی تصدیق کر دیں، اب ان کے لیے یہ کسی طرح بھی جائز نہیں رہ جاتا کہ وہ ان اصولوں کا نام بدستور اب بھی لیتے جائیں اور اپنے آپ کو اس جماعتی لقب سے موسوم کرتے رہیں جو کبھی ان اصولوں کی صحیح نمایندگی کے سبب ہی انھیں ملا تھا۔ کیونکہ اب وہ ان کے نمایندے باقی نہیں رہے۔

اصول اسلام کی شرکت بیزاری

اس اصولی حقیقت کا اطلاق دنیا کی ہر جماعت پر ہوتا ہے۔ امت مسلمہ بھی اس کلیے سے کسی طرح مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ اس کی بھی اپنی واقعی زندگی کا دار و مدار' اول و آخر' اپنے اصل مقصدِ وجود اور اپنے اصول حیات ہی پر ہے۔ اس کے لیے بھی اپنے اصولوں کی اہمیت ویسی ہی ہے جیسی کہ کسی اور جماعت کے لیے اس کے اصولوں کی ہوسکتی ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ کیونکہ زندگی کے دوسرے مسلکوں کے مقابلے میں اسلامی مسلک حیات کی ایک ممتاز نوعیت ہے۔ وہ ایک ایسی خصوصیت کا حامل ہے جو کسی اور مسلک (ازم) اور نظام میں نہیں پائی جاتی۔ دنیا میں اسلام کے علاوہ دوسرے جتنے بھی نظام پیش کیے گئے ہیں وہ

سب انسان کے اپنے دماغ کی پیداوار ہیں۔ اس لیے مزید غور وفکر اور نئے تجربات اور معلومات کی روشنی میں ان کے اندر ترمیم کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے حتی کہ ضرورت جب مجبور کر دیتی ہے تو ان میں کتنے ہی بیرونی اصولوں کا پیوند بھی لگا لیا جاتا ہے جس پر ان کے مخلص سے مخلص اور پر جوش سے پر جوش عقیدت مندوں کو بھی عموماً کسی احتجاج کا خیال تک نہیں آتا۔ لیکن اسلام کا معاملہ اس باب میں بالکل دوسرا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میرا پیش کیا ہوا مسلکِ حیات اور میرے اصول کسی انسانی دماغ کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ یہ اُس علیم و خبیر کے تجویز فرمائے ہوئے ہیں جو نوع انسانی کے فطری تقاضوں، اس کی انفرادی اور اجتماعی مصلحتوں اور اس کی تمام داخلی اور خارجی ضرورتوں کا صحیح اندازہ داں ہے۔ اور جس کی نگاہ سے انسانی سرشت کا کوئی گوشہ بھی مخفی نہیں۔ اس لیے یہ مسلک کامل عدل اور توازن کا مسلک ہے، فطرت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے، عالمگیر اور جہانی ہے، وقت اور جگہ کی حد بندیوں سے آزاد اور کسی ترمیم کی ضرورت سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہے۔ بشری علوم و افکار اور نئے سے نئے تجربات اور معلومات اس کی کسی ایک اصل پر بھی کبھی انگلی نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے اگر کسی نے اس کی پیروی کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی ایسی کوئی جسارت کرنی چاہی تو اس کا شمار اس کے باغیوں میں ہوگا' نہ کہ فرمانبرداروں میں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا یہ رویہ بہت سخت اور سرتا سر آمرانہ ہے لیکن یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو یا تو اسلام کے اس دعویٰ ہی کا منکر ہو کہ وہ ایک خداوندی مسلک حیات ہے۔ یا پھر وہ حقیقت اور گمان میں فرق ہی کرنا نہ جانتا ہو اور علمِ الٰہی کو علمِ انسانی پر قیاس کرتا ہو، ورنہ اس سے بڑا عقلی دیوالیہ پن اور کیا ہوگا کہ ایک شخص یہ بھی کہتا ہو کہ اسلام کے پیش کیے ہوئے اصولوں کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہو کہ یہ اصول قابلِ ترمیم بھی ہو سکتے ہیں۔ اس مسلک حیات کا کٹر سے کٹر مخالف بھی ازروئے انصاف کسی کو یہ حقِ آزادی نہیں دے سکتا کہ ایک طرف تو وہ اسلام کی عقیدت کا دم بھرے، دوسری طرف اس کے اصولوں پر عمل جراحی بھی کرتا پھرے۔ ہاں اس کو یہ آزادی ہر وقت حاصل ہے کہ وہ سرے سے

اسلام ہی کو چھوڑ دے اگر اس کے پورے دعوے کی پوری سچائی میں اسے تردد ہو اور اس کے نزدیک اس کے اصول ترمیم و اصلاح کے محتاج ہوں۔

اس فرق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اگر کسی اور جماعت کے لیے اپنے مسلک کے مخالف اصولوں سے تعاون یا مصالحت کرنا ممکن ہو تو ہو، مگر اسلام کے نام پر بننے والی جماعت کے لیے تو کسی غیر اسلامی نظامِ زندگی سے مصالحت یا مداہنت کا تصور بھی حرام ہے۔ چنانچہ جب قرآن نازل ہو رہا تھا اور ملت اسلامیہ کی بنیادیں بھری جا رہی تھیں تو اس کو مخالف کیمپ سے اس پالیسی کے اختیار کر لینے کی بار بار ترغیب ملتی رہی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قطعی ہدایت تھی کہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھی اس ترغیب کو ہرگز خاطر میں نہ لائیں۔ مثلاً اس کیمپ نے جب اپنی اسلام دشمن تدبیروں اور سرگرمیوں کو کسی طرح بھی کامیاب ہوتے نہ دیکھا تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ:

ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ یونس 15:10

اس قرآن کے بجائے کوئی دوسری کتاب لائیے، یا پھر اس میں ردوبدل کر دیجیے۔

اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا منشا صاف ظاہر ہے۔ دراصل یہ ایک تجویز یا مطالبے سے زیادہ ان کی طرف سے ایک پیشکش تھی۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اپنی تعلیمات میں ہمارے مشرکانہ افکار و عقائد کے لیے بھی کوئی گنجائش نکال دیں تو ہم ان کی مخالفت سے باز آ جائیں گے۔ اور ان کی بات مان کر ان کے پیرو بن جائیں گے۔ ان کی اس تجویز یا پیش کش کا جو جواب اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دلایا وہ یہ تھا:

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ
یونس 15:10

ان سے کہہ دو کہ مجھے اس بات کا قطعاً کوئی استحقاق نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس قرآن میں کوئی ردوبدل کر دوں۔ میں تو بس اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

اصولی اور بنیادی باتیں تو خیر بڑی چیز ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ نے تو اپنے پیغمبرؐ کو اس بات سے بھی پوری سختی کے ساتھ خبردار کر دیا تھا کہ خواہ حالات کا تقاضا اور وقت کی مصلحت کچھ ہی

کیوں نہ ہو وہ شریعت کے کسی ایک جزوی قانون کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے:

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ المائدہ 49:5

اے پیغمبرؐ! ان کے درمیان اس قانون کے مطابق فیصلہ کرو جسے اللہ نے نازل فرمایا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو، اور دیکھو! اس بات سے ہوشیار رہو کہ کہیں یہ لوگ تم کو اس ہدایت کے کسی جز سے (غافل کر کے) فتنہ میں نہ ڈال دیں جس کو اللہ نے تم پر اتارا ہے۔

یہ تو اسلامی تعلیمات میں کسی بنیادی یا جزئی ترمیم کی خواہش اور کوشش کا معاملہ تھا۔ اس کے بعد دوسرے درجے پر ان کی ایک اور خواہش اور کوشش ہوئی اور وہ یہ کہ کاش محمد صلی اللہ علیہ وسلم، تبلیغ دین کے بارے میں مداہنت سے کام لیں تو وہ بھی یہی پالیسی اختیار کرلیں: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ القلم 9:68 اور یوں یہ کش مکش ختم ہو جائے۔

''مداہنت سے کام لینے'' کا مطلب یہ تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم شرک کی تردید سے باز آ جائیں اور اپنی دعوتِ توحید کو صرف اثباتی پہلو سے پیش کرنے پر اکتفا کرلیں۔ گویا ان کی پہلی تجویز یا پیشکش، اسلام اور شرک کا آمیزہ بنا لینے کی خواہش تھی تو یہ دوسری پیشکش اسلام اور شرک کے ''پُرامن باہمی وجود'' کی خواہش تھی۔ مگر جس طرح پہلی کے منظور کر لیے جانے کو ناممکن فرمایا گیا اسی طرح اس دوسری خواہش کو بھی یک لخت ٹھکرا دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی حکم دیا کہ اس طرح کی باتیں ہرگز نہ مانیں، (وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ القلم 10:68)

یہ قرآنی تصریحات اسلام کے اصولوں ہی کا نہیں بلکہ اس جمیع تعلیمات اور اس کے مخصوص مزاج، سب کا مقام بالکل واضح طور سے متعین کر دیتی ہیں۔ ان کے بعد کسی شخص کو یہ کہنے کی اجازت ہرگز نہیں دی جا سکتی کہ اسلام کو اپنا لینے یا اپنائے رکھنے کے باوجود اس کے اصولوں کی پیروی میں انسان آزاد ہے اور حسب ضرورت ان میں ترمیم کر لے سکتا ہے۔

مقصد شناسی کا معیاری نمونہ

عملاً آج امت مسلمہ کی جو حالت بھی ہو مگر اپنی زندگی کے آغاز میں ہر با اصول جماعت کی طرح یہ جماعت بھی اپنے مقصد کا گہرا عشق اور اپنے اصولوں کا سچا یقین لے کر اٹھی تھی۔ اور اس طرح اٹھی تھی کہ رکاوٹوں کی کوئی بڑی سے بڑی چٹان بھی اس کا رخ نہ موڑ سکی۔ اس راہ میں اسے کیا کچھ پیش نہیں آیا؟ جانی اور مالی مصیبتوں نے اس پر یورش کی‘ سخت ترین خطرات نے اسے دھمکایا‘ رات کی نینداس کی چھنی‘ دن کا سکون اس کا برہم ہوا۔ قید و بند کی آزمائشوں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ مگر تاریخ گواہ ہے اور اس کی اس گواہی کو کوئی بھی جھٹلا نہیں سکتا کہ ہولناک مصائب اور مشکلات کے اس امنڈتے ہوئے طوفان میں بھی یہ جماعت اپنے اصل موقف سے ایک انچ ہٹنے پر بھی کبھی راضی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اگر وہ مصالحت اور مداہنت کو ذرا بھی راہ دے دیتی تو یہ سارا ہنگامۂ مصائب یک دم سرد پڑ جاتا۔ دن رات کی بے اطمینانیاں امن و سکون سے بدل جاتیں۔ معاشی تنگیاں بھی دور ہو جاتیں اور پورا عرب اس کی سیاسی برتری کو بھی بڑی آسانی سے تسلیم کر لیتا۔ جیسا کہ تاریخ[1] بتاتی ہے اور قرآن کے کھلے ہوئے اشارات سے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لیڈر اور پیرو سبھی جانتے تھے کہ مداہنت، یعنی شرک اور توحید کے پُرامن باہمی وجود کی دعوت‘ ان کے لیے موت کی دعوت ہے کیونکہ اپنے اصولوں کو چھوڑ دینے کے بعد ان کا وجود اپنے مقصد کے لحاظ سے بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اس لیے یہ لوگ آگ اور خون کے طوفانوں میں بھی اپنے مرکز پر جمے رہے۔ اور حالات کی کوئی ناسازگاری یا مصلحت انھیں اپنے مسلک سے بال برابر بھی نہ ہٹا سکی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے تمام ہنگامی مسئلوں‘ مادی مصلحتوں‘ ظاہری تدبیروں اور وقت و ماحول کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ بس ایک ’’جنون‘‘ ہے جس نے انھیں ’’عقل و دانش‘‘ کا دشمن بنا ڈالا ہے۔ چنانچہ اس زمانے کے سیاست دانوں اور

1۔ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صاف لفظوں میں یہ پیش کش کی تھی کہ اگر آپؐ ہمارے معبودوں کے خلاف تنقید کرنے سے باز آجائیں تو ہم نہ صرف یہ کہ آپؐ کی مخالفت ترک کر دیں گے بلکہ آپؐ کے حسب خواہش آپؐ کی خدمت میں مال و دولت بھی لا کر ڈھیر کر دیں گے اور آپؐ کو اپنا سردار بلکہ بادشاہ بنا لیں گے۔ (سیرت ابن ہشام۔ جلد اول)

مدبّروں کا متفقہ فیصلہ ان کے بارے میں یہی تھا بھی کہ ''انھیں ان کے دین نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے'' (غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ۭ الانفال 49:8) اور یہ کہ یہ ''سُفَهَاء'' ہیں۔

اگرچہ دنیا نے جلد ہی اس ''خودفریبی'' اور ''سفاہت'' کی حقیقت دیکھ لی اور زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ تاریخ انسانی کا وہ حیرت انگیز انقلاب وجود میں آیا جس کی منطقی توجیہہ کرنے میں بڑی بڑی عقلیں دنگ ہیں۔ جن کو اپنے گھروں میں بھی سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی قیصر و کسریٰ کے تاج اُن کے قدموں میں آ پڑے، اور ایک صدی بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ وہ یورپ' ایشیا اور افریقہ کے بیشتر حصوں پر چھا گئے۔ صرف ان کی زمینوں پر ہی نہیں بلکہ وہاں رہنے والوں کے دلوں اور دماغوں پر بھی۔ یہ سب کچھ یقیناً اسی گہری فدویت اور وفاداری کے طفیل ہوا جو ان کے دلوں میں اپنے مقصدِ وجود اور اپنے اصولِ حیات کے لیے موجود تھی اور جس نے انھیں انھی کے لیے جینا اور مرنا سکھا دیا تھا۔

مقصد شناسی کا زوال

اسلام کے اس ابتدائی دور کے گزر جانے کے بعد اس امت پر وہ دور آیا جب اس کے افراد کے ذہنوں میں اپنے مقصد زندگی کے نقوش ماند پڑنے شروع ہوئے اور مختلف اسباب کے تحت ان کے اندر مداہنت کی بیماری جڑ پکڑنے لگی اور زمانے کے ساتھ ساتھ برابر ترقی کرتی گئی۔ غیر اسلامی اصول و نظریات مسلمانوں میں اس طرح پھیلنے لگے جیسے کسی دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ ان کی روک تھام کے لیے علمائے حق کی طرف سے بہت کچھ کوششیں بھی ہوتی رہیں مگر ناتربیت یافتہ عوام کی خام مذہبیت اور حکومتوں کی نافرض شناسی نے ان کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہ ہونے دیا اور یہ بیماری مسلم معاشرے کے اندر آہستہ آہستہ اسلامی اصول و افکار کی جڑیں کھوکھلی کرتی رہی۔ جب تک اس جماعت کا سیاسی اقتدار قائم رہا اس وقت تک تو ان اصولوں کے بارے میں اس نے مجموعی حیثیت سے خود فراموشی اور خودکشی کی راہ نہیں اختیار کی مگر جب سیاسی زوال نے بھی اسے آ لیا تو اس فکری زوال کی تیز رفتاری سیلاب سے باتیں کرنے لگی۔ اور ہوتے ہوتے اب وہ وقت آ پہنچا ہے

کہ یہ جماعت اپنے آپ کو گویا پہچانتی ہی نہیں۔ اس کے افراد کی بہت بڑی اکثریت اپنے اصول و مقاصد اپنے مسلک اور اپنے وجود کی غرض و غایت کو اس طرح بھول چکی ہے کہ اگر ان چیزوں کو سامنے رکھا جائے تو وہ نہ صرف یہ کہ ان سے اجنبیت محسوس کرتی ہے بلکہ بسا اوقات پورے اطمینان اور ادعائے تحقیق کے ساتھ اس کو غیر اسلام یا زائد از اسلام ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگتی ہے۔ جو چیزیں ان اصولوں کی بالکل مخالف ہیں وہ ان پر دیوانہ وار ٹوٹی پڑتی ہے اور انھیں مطابق اسلام قرار دینے پر مُصر ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تمام تر جدوجہد اپنے ہی مقصد حیات کی پامالی میں صرف ہو رہی ہے۔ اگرچہ خوش فہمی یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسلام اور امت مسلمہ کی سرفرازی کا باعث ہوگا! بظاہر یہ محض ایک دعویٰ ہے مگر یہ دعویٰ ایسا ہے جو دلیل سے بے نیاز ہے۔ اللہ نے جس کسی کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں دی ہیں وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ حقیقتِ واقعہ اس کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔

اس سے انکار نہیں کہ ایک چھوٹی سی اقلیت ایسے لوگوں کی بھی اس جماعت میں موجود ہے جو بحمد اللہ خود فراموشی اور خودکشی کے اس مقام تک ابھی نہیں پہنچی ہے بلکہ اس کی نگاہ اپنے نصب العین کے جلووں سے ابھی تک آشنا ہے اور وہ اسلام کے اصول و مقاصد کی یاد اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ لیکن انکار اس بات کا بھی تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس خود شناس اقلیت کے بیشتر افراد کا حال بھی عملی نقطۂ نگاہ سے کچھ قابلِ اطمینان نہیں اور ان کے اندر یہ یاد محض ایک متبرک یادگار بن کر رہ گئی ہے جس میں زندگی کی حرارت یا تو رہی نہیں یا اتنی مدھم پڑ چکی ہے کہ محسوس نہیں ہوتی۔ حالات کی ناسازگاری اور مخالف قوتوں کی قہاری نے ان کے سروں میں وہ سودا ہی باقی نہیں رہنے دیا جس کے بغیر کسی بڑے مقصد اور اصول کا نام لینا کچھ زیب نہیں دیا کرتا۔ اس لیے ان لوگوں نے بھی خاموش مصالحت کی پُرامن رَوِش اختیار کر رکھی ہے اور اس بات کی احتیاط رکھنا گویا ان کی مستقل پالیسی بن گئی ہے کہ ان پر ''سیاست و تدبر'' کی طرف سے ''مذہبی مجنون'' ہونے کا الزام نہ لگنے پائے۔ وہ دیکھتے اور جانتے سب کچھ ہیں مگر اپنے کو یہ ''سمجھا کر'' خاموش ہیں کہ دین میں آسانی رکھی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں قرار دیا ہے بلکہ ایسے اقدام و عمل سے باز رہنے کی وصیت فرمائی ہے جس میں مہلکے ہوں۔

امت ''قسمت بقدر رحمت'' کے قانون کی زد میں

ان حالات میں یہ جماعت اگر آج دنیوی جاہ و اقبال کی مالک ہوتی تو بھی اسلام کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ اس کا مجرد سیاسی اقتدار اس کی نظروں میں کوئی وقعت رکھتا ہی نہیں۔ اس کو تو جو کچھ بحث اور دلچسپی ہے، صرف اپنی اقامت سے ہے اس نصب العین کو پسِ پُشت ڈال کر اس کے نام لینے والوں نے ہفت اقلیم کی شہنشاہی بھی حاصل کر لی تو اس کے کس کام کی؟ مگر قدرت نے یہ چیز بھی تو آج ان کے پاس باقی نہیں رہنے دی ہے۔ انھوں نے اپنے مقصد وجود کو دیوار پر پھینک کر جو کچھ پایا وہ محکومی یا نیم محکومی کا وہ داغ ہے جو ہر جماعت کی پیشانی پر تو لگ سکتا ہے مگر سلطانِ کائنات کی پارٹی......حزب اللہ...... کی پیشانی پر ہرگز نہیں لگ سکتا۔ یہ داغ اتنا گھناؤنا ہے کہ ہر دیکھنے والے کو اس پر حیرت ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ امت کے ابتدائی دور میں اس کے عروج کو دیکھ کر حیرت ہوا کرتی تھی یعنی عروج و زوال کے عام فلسفے کی رُو سے امتِ مسلمہ کا عروج بھی ایک معجزہ تھا اور اب اس کا زوال بھی ایک ''جوابی معجزہ'' ہے۔ عقلیں نہ اس غیر معمولی اقبال کی کوئی اطمینان بخش توجیہہ کر پاتی ہیں اور نہ اس غیر معمولی اِدبار کی .... حد یہ ہے کہ خود اس امت کی بہت بڑی اکثریت بھی حیرت زدہ ہے کہ یہ کیا سے کیا ہو گیا؟ وہ رہ رہ کر یہ سوچتی ہے کہ آخر ہماری ایسی زبوں حالی کا سبب کیا ہے؟ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ہمارے ایمان میں کمزوری آ گئی ہے، ہم بدعمل ہو گئے ہیں، ہمارے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں، ہم احکام دین سے غافل ہیں۔ یہ سب کچھ سہی مگر پھر بھی بُرے بھلے جیسے ہیں آج اس دنیا میں صرف ہم ہی توحید کے تنہا علم بردار ہیں۔ ہم اگر سر جھکاتے ہیں تو خدا ہی کے سامنے جھکاتے ہیں اس کے رسولِ پاک کا حلقۂ اطاعت ہے تو صرف ہماری گردنوں میں ہے۔ اس کے احکام پر اگر کچھ عمل کرتے ہیں تو ہم ہی کرتے ہیں........... اور ہمارے بالمقابل ساری دنیا کافر و مشرک

ہے۔خدا کی باغی اور توحید کی منکر ہے۔ رسولؐ کی مخالف اور قرآن کی دشمن ہے، پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم پست اور وہ سربلند، ہم مفلس اور وہ دولت مند، ہم ذلیل وخوار اور وہ صاحبِ اقتدار، ہم غلام ومحکوم اور وہ آزاد وحکمران! حالانکہ جب ہم بہر حال غیروں کی بہ نسبت اللہ سے زیادہ قریب ہیں تو ان کے مقابلے میں ان الٰہی انعامات کے زیادہ مستحق ہم تھے نہ کہ وہ۔

یہ حیران کن سوال دراصل اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ہم قوموں کے عروج وزوال کے اس فلسفے سے ناواقف ہو گئے ہیں جسے قرآن حکیم نے بیان فرمایا ہے۔ ورنہ طبعی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے ہم ٹھیک اسی مقام پر ہیں جہاں ہونا چاہیے تھا۔صورتِ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے میدان میں دو قسم کے قوانین کارفرما ہیں: ایک تو قوانینِ طبعی دوسرے قوانین اخلاقی[1] قوموں کے اٹھانے اور گرانے میں یہ دونوں ہی قسم کے قوانین کام کرتے ہیں۔ مگر دونوں میں ایک فرق ہے، اور وہ یہ کہ تنہا قوانین طبعی تو ایک قوم کو میدان مقابلہ میں فتح و غلبہ دلا سکتے ہیں لیکن قوانین اخلاقی میں مشیت نے یہ قوت نہیں رکھی ہے کہ وہ طبعی قوانین کی تھوڑی بہت مدد لیے بغیر بھی اکیلے ہی کسی قوم کو غالب و فتح مند بنا دیں۔قوانین اخلاقی کو دراصل قوموں کی باہمی کشمکش اور جنگی معرکوں میں ''خصوصی اختیار فیصلہ'' کا مقام حاصل ہے اور اس خصوصی اختیار کا استعمال وہ طبعی قوانین اور مادی قوتوں کی موجودگی ہی میں کرتے ہیں یعنی اگر دونوں فریق جنگ صرف مادی تیاریوں کے ساتھ نبرد آزما ہوں تو فتح اس کی ہوگی جو لڑائی کے اسباب و ذرائع زیادہ لے کر میدان مقابلہ میں آیا ہوگا اور اگر ایک طرف صرف مادی قوتیں ہوں اور دوسری طرف محض اخلاقی اور روحانی قوتیں ہوں تو فریق ثانی کا شکست کھانا یقینی ہے بلکہ اسباب وعلل کی اس دنیا میں فی الواقع یہ مقابلہ کوئی مقابلہ ہی نہیں۔لیکن اگر مادی تدابیر اور اسباب و ذرائع کے اعتبار سے دونوں فریق برابر ہوں مگر ساتھ ہی ایک فریق اخلاقی قوتوں سے بھی مسلح ہو تو بلاشک وشبہ اسی کو غلبہ حاصل ہوگا اور اس

---

[1] ''اخلاقی'' سے مراد یہاں حقیقی دینی اخلاق ہیں نہ کہ افادی اور تجربی اخلاق۔ ورنہ افادی اخلاقیات سے بھی کوئی قوم اگر بے بہرہ ہو تو وہ محض طبعی قوانین کے بل پر غلبہ نہیں حاصل کر سکتی۔ اس جگہ افادی اخلاقیات کو بھی طبعی قوانین ہی کے اندر شمار کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مادی تدابیر کے سوا کچھ نہیں۔ انھیں اخلاق کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔

کی اخلاقی قوتیں بڑھ کر اس جنگ کا فیصلہ اس کے حق میں کر دیں گی جسے فریقین کے یکساں مادی سروسامان کے باعث بظاہر کبھی ختم ہی نہ ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قرآنی تصریحات تو یہاں تک بتاتی ہیں کہ اگر مادی وسائل میں وہ فریق مخالف کا دسواں حصہ ہو تو بھی اس کی اخلاقی قوتیں خصوصی ''اختیار فیصلہ'' بن کر اسے فتح یاب بنا دیتی ہیں اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ یہ قوتیں اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد اور مافوق الطبعی نصرت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ بشرطیکہ ایک طرف تو اس نے اپنے مقدور بھر مادی وسائل اور تدابیر سے کام لینے میں دریغ نہ کیا ہو اور دوسری طرف اپنے ایمان کو خوب راسخ اور اپنے اعمال کو صالح بنا لیا ہو۔ یا یوں کہیے کہ اس کے اندر اپنے اصولوں کا حقیقی عشق اور اپنے مسلکِ زندگی کا زندہ جنون موجود ہو۔ اس غیبی مدد اور مافوق الطبعی نصرت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح وعدے کیے گئے ہیں مثلاً:

(۱) كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ البقرہ 249:2

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب ہوتی ہیں۔

(۲) وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ آل عمران 139:3

نہ سست پڑو اور نہ غمگین ہو۔ تم ہی اونچے رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔

(۳) اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ الانفال 65:8

اگر تمھارے بیس ثابت قدم اشخاص ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے۔

(۴) اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ الانبیا 105:21

یقیناً زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝

المائدہ 56:5

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کو اور مومنوں کو اپنا ساتھی بنائے گا تو (وہ بامراد اور سربلند ہو گا) بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔

اس غیبی مدد کے ظہور کی مثالیں ہر دور میں پائی جا سکتی ہیں۔ خود اس امت کی ابتدائی تاریخ

اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ بدر و اُحد اور احزاب و حنین کے معرکوں میں خدا کی "اَن دیکھی" فوجوں نے جو کرشمے انجام دیے، قرآن کے صفحوں میں وہ آج بھی محفوظ ہیں۔

یہ ہے مخصوص ضابطہ کسی مومن گروہ کے عروج کا، اور یہی مخصوص ضابطہ تھا جس نے امت مسلمہ کا ابتدائی دور غیر معمولی عظمت اور سربلندی کا دور بنا دیا تھا۔

لیکن جہاں دوسری اہلِ ایمان جماعتوں کی طرح اس جماعت کو بھی قدرت کی یہ خصوصی نظر عنایت حاصل ہے وہیں اس کی ذمے داریاں بھی بہت نازک ہیں اور اس کو اس خاص وعدے کے ساتھ ایک خاص وعید سے بھی خبردار کیا جا چکا ہے جس کی طرف سے افسوس ہے کہ اس نے اپنے کان بند کر لیے ہیں اور یہی کان بند کر لینا ہی دراصل اس کے لیے غلط فہمیوں اور ہلاکتوں کا باعث بنا ہے۔ اور وہ سوال پیدا کر دیا گیا ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اس اجمال کی شرح یہ ہے کہ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں کا جو قانون بیان فرمایا ہے اس کی رُو سے جس فرد یا گروہ پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم جتنا ہی زیادہ ہوتا ہے اس فضل و کرم کی ناشکری یعنی احکام الٰہی سے بے پروائی برتنے پر اس کی پکڑ بھی اتنی ہی زیادہ سخت اور ہولناک ہوتی ہے۔ محکومی و نامرادی کی جتنی سزا وہ دوسری قوموں کو برے اعمال کی پاداش میں دیا کرتا ہے اتنے برے اعمال کے ارتکاب پر اس قوم کو اس سے دوگنی یا کئی گنی سزائیں دیتا ہے جو اس کے کچھ مخصوص انعامات سے سرفراز کی جا چکی ہو۔ قرآن حکیم کی چند شہادتیں سنیے۔ سب سے پہلے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی مقام کو لے لیجیے جن سے بڑھ کر محبوب اور مقرب بندہ عالمِ وجود میں آیا ہی نہیں۔ مگر یہ بات اُسی محبوب ترین بندے کو مخاطب کر کے کہی گئی تھی کہ:

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ بنی اسرائیل 17:75-74

اگر ہم تم کو (حق پر) ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم کفار کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یقیناً ہم اس وقت تم کو زندگی اور موت دونوں میں (یعنی دونوں جہانوں میں) دوہرا عذاب چکھاتے، پھر تم ہمارے خلاف کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔

دوسری مثال ازواج مطہراتؓ کی لیجیے۔ ان کو جہاں یہ رتبہ بخشا گیا تھا کہ وہ

''امہات المومنین'' ہیں اور ان کی حیثیت عام عورتوں جیسی نہیں ہے (یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ) (الاحزاب 32:33) نیز یہ کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی صدقِ دل سے تابعداری کریں اور اچھے کام کریں تو عام لوگوں کی بہ نسبت ان کو دوگنا اجر ملے گا۔ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا (الاحزاب 31:33) وہیں اس حقیقت سے بھی انھیں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ

الاحزاب 30:33

اے نبیؐ کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوگی اس کو دوگنا عذاب دیا جائے گا۔

افراد کے بعد قوموں کی مثال لیجیے۔ یہودی قوم وہ قوم ہے جس پر مدتوں انعاماتِ الٰہی کی بارشیں ہوتی رہیں۔ جس کو دشمن سے بچانے کے لیے سمندر خشک کر دیا گیا۔ جس کی معاشی مشکلات کے وقت من وسلویٰ کا نزول ہوتا رہا۔ لق ودق بیابانوں میں جس کے سر پر رحمت کے فرشتے بدلیوں کی چھتریاں تانے ساتھ چلتے تھے اور جس کو تمام اقوامِ عالم پر برتری دی گئی تھی۔ لیکن جب اسی سربلند اور محبوب جماعت' اور موجودہ توریت کے لفظوں میں ''خدا کی اپنی قوم'' نے اپنے عہدِ بندگی کو فراموش کر دیا' اور احکامِ الٰہی سے سرتابی کر کے فسق وفجور میں غرق ہوگئی تو اس پر اللہ کا غضب ٹوٹ پڑا۔ اور اس طرح ٹوٹا کہ یہ قوم پہلے جتنی سربلند تھی اب اتنی ہی ذلیل ہوگئی۔ جس قدر محبوب تھی اسی قدر مغضوب ہو رہی۔

غرض یہ اللہ تعالیٰ کی ایک کبھی نہ بدلنے والی سنت ہے کہ اس کی نقمت بقدر رحمت ہوا کرتی ہے اور جیسا کہ چاہیے' یہ سنت ٹھیک عدل پر مبنی ہے، چنانچہ عام انسانی فطرت بھی اِسی روش پر عمل پیرا ہے۔ ہم ایک اجنبی آدمی سے اس حسنِ سلوک کے امیدوار نہیں ہوتے جس کی امید ہمیں اپنے اعزہ سے ہوتی ہے۔ ایک غیر شخص اگر ہماری باتوں کو نہیں مانتا' اُن کی تکذیب اور مخالفت کرتا ہے تو ہم اس پر زیادہ رنجیدہ یا مشتعل نہیں ہوتے۔ لیکن یہی بات اگر اپنے کسی نمک خوار نوکر یا ناز پروردہ بیٹے سے سرزد ہو جائے تو اس وقت ہمارے غم و

غصے کی انتہا نہیں رہتی۔ اور ہم اس کی اس حرکت کا وہ جواب دیتے ہیں جو ایک غیر آدمی کو کبھی نہیں دے سکتے۔ اس فرق کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے۔ غیر کی مخالفت کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ ایک سچی بات کا منکر اور دشمن ہے لیکن اس یگانے کی مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مخالفتِ حق کے ساتھ ساتھ نمک حرامی بھی موجود ہے۔ اور یہ وہ جرم ہے جسے انسانیت کا ضمیر کبھی معاف نہیں کرتا۔ بالکل یہی اصول اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کے بارے میں برتتا ہے اور ان افراد یا اقوام کو جو اس کی مخصوص عنایتوں سے سرفراز ہونے کے باوجود اس کے احکام کی مخالفت پر اتر آتی ہیں عام حالت کی بہ نسبت دوگنی سزائیں دیتا ہے۔ کیونکہ وہ بیک وقت دو جرموں کی مرتکب ہوتی ہیں، ایک تو مخالفتِ حق کی دوسرے احسان کشی اور نمک حرامی کی۔

اسی سنتِ الٰہی کی روشنی میں امتِ مسلمہ کے ماضی اور حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس نے اس امت کو تقریباً وہ ساری کی ساری نعمتیں بھی بخشیں جو اس سے پہلے دوسری تمام امتوں کو دی گئی تھیں۔ اور ان کے علاوہ وہ نعمتیں بھی جو اب تک کسی امت کو نہیں ملی تھیں۔ آخر یہ سارے جہان کی امامت کا منصب[1] اور سب سے بہتر امت[2] ہونے کا اعزاز، یہ امت وسط[3] اور شہداء علی الناس[4] کے خطابات، یہ اکمال دین[5] اور اتمام نعمت[6] کے انعامات اس سے پہلے بھی کسی امت کو ملے تھے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر غور کیجیے کہ اس امت کی ذمہ داریاں کتنی بھاری ہوں گی؟ اور ان ذمے داریوں کو چھوڑ بیٹھنے کے نتائج کتنے خطرناک ہو سکتے

۱۔ ۲۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ آل عمران 110:3

تم بہترین امت ہو جو تمام لوگوں (کی امامت و رہنمائی) کے لیے برپا کی گئی ہے۔

۳۔ ۴۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ البقرہ 143:2

اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے تاکہ تم سب لوگوں کے لیے حق کے گواہ بنو۔

۵۔ ۶۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ المائدہ 3:5

آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔

ہیں؟ جزا وسزا کا جو قانون اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی محترم ازواج رضی اللہ عنہن کے حق میں بھی اتنا بے لچک تھا وہ دوسروں کے بارے میں کوئی نرمی کیسے دکھا سکتا ہے؟ اگر ''اس بہترین امت'' کا عملی ریکارڈ ویسا ہی یا قریب قریب ویسا ہی ہے جس کے لیے وہ مبعوث کی گئی تھی تو یقیناً اسے اپنی موجودہ زبوں حالی پر تعجب کرنے کا پورا حق ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے مقصدِ وجود سے غافل ہو چکی ہے تو پھر اسے تعجب اپنی حالت پر نہیں، بلکہ اپنی سادہ لوحی اور اپنی خوش فہمی پر کرنا چاہیے۔ آخر قدرت نے کب اور کس پر ظلم کیا ہے، جو آج وہ اس امت کے بارے میں انصاف کو بھول گئی ہوگی اور بھول کر اسے بلاوجہ پستی کے گڑھے میں دھکیل گئی ہوگی۔ ذرا دیکھ تو لیجیے کہ اس امت کی ذمے داری کیا تھی؟ اور اس وقت وہ اسے ادا کس طرح کر رہی ہے؟ اس کی ذمے داریوں کا ضروری تعارف تو اگرچہ ابھی پچھلے باب میں نظروں سے گزر چکا ہے لیکن مناسب ہوگا کہ بعض اور تصریحات بھی سن لی جائیں۔ قرآن مجید مسلمانوں سے کہتا ہے:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ط الاعراف 3:7

تمھارے رب کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا ہے اس کی پیروی کرو اور اسے چھوڑ کر (دوسرے جھوٹے) خداوندوں کا اتباع نہ کرو۔

مسلمان کا کیا رویہ ہونا چاہیے اور اُسے کارزارِ حیات میں کون سا کردار ادا کرنا ہے؟ قرآن مجید کا صرف یہی ایک جملہ اس سوال کا مثبت اور منفی ہر پہلو سے واضح جواب دے دیتا ہے اس سے یہ بھی صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور یہ بھی کہ کیا نہ کرنا چاہیے؟ ایک طرف تو ہر وہ حکم اور ہدایت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہو اس کے لیے واجب التعمیل ہے۔ خواہ اس کا تعلق عقائد اور عبادات سے ہو خواہ اخلاق اور معاملات سے، انفرادی مسائل سے ہو یا اجتماعی سے، مسجد اور مدرسے سے ہو یا گھر اور بازار سے، اسمبلی اور پارلیمنٹ سے ہو یا بزمِ صلح اور میدانِ جنگ سے۔ غرض کوئی موقع ہو یہی احکام و ہدایات اس کے نظریوں کی بنیاد ہوں گے۔ یہی اس کے رویے کا فیصلہ کریں گے۔ اور انھی کا پابند ہو کر اسے رہنا پڑے گا۔ دوسری طرف اپنے اس حقیقی مالک کے سوا (اور اس کے بھیجے ہوئے

پیغمبر کے علاوہ) اگر کسی اور جانب سے کوئی نظریہ' کوئی اسوہ' کوئی ضابطہ اور کوئی فیصلہ اس کے سامنے آتا ہے تو وہ لازماً اس کے لیے قابلِ رد ہے۔ جیسا ضروری اس کے لیے یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے ہر حکم کو بجا لائے ٹھیک ویسا ہی ضروری امر یہ بھی ہے کہ ہر بیرونی شے کو دیوار پر دے مارے۔

قرآن کے اس مطالبے کو سننے کے بعد دو ہی راہیں اختیار کی جاسکتی ہیں' یا تو اس کا انکار کر دیا جائے' یا پھر غیر مشروط طریقے پر سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔ انکار کرنے کے معنی جس طرح یہ ہیں کہ انسان قرآن کو حق نہیں مانتا اور امر و حکم کو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص نہیں سمجھتا' اسی طرح اس مطالبے کو غیر مشروط طریقے پر تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تسلیم کرنے والا قرآن کو برحق تو مانتا ہی ہے اب وہ اس بات کا بھی اقرار و اعلان کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی ایک ہدایت کی بھی پابندی سے گریز نہ کرے گا۔ یہ ایک بالکل کھلی ہوئی اور سادہ سی حقیقت ہے کہ جس سے کسی اختلاف کی بابت سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ اب اس حقیقت کے ہوتے ہوئے دین کی صرف بعض پابندیوں کو قبول کرنے اور بعض سے کترا کر نکل جانے کا رویہ جتنا غیر معقول اور مضحکہ خیز ہوسکتا ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں' جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس نے تو ایسی بین بین کی روش اختیار کرنے والوں کو اپنا فیصلہ ان صاف اور صریح لفظوں میں سنا رکھا ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ

البقرہ 85:2

کیا تم کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے۔ سو ایسا کرنے والوں کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف لے جائے جائیں۔

قرآن کا یہ فیصلہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اس کا مطالبہ کامل حوالگی کا ہے۔ یعنی وہ جو کچھ بھی کہے اس پر اور صرف اسی پر عمل ہونا ضروری ہے۔ اس نے اپنے پیرؤوں کے لیے

زندگی کے مختلف شعبوں میں جو حدیں قائم کر دی ہیں ان کے آگے قدم اٹھانے کی ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا کرنے والوں کو وہ ظالم قرار دیتا ہے: (وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ) (البقرہ 229:2) اس لیے قرآن پر ایمان لانے اور مسلم ہونے کے مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ جزو کو بھی ترک نہیں کیا جا سکتا۔

اب ذرا سرسری نظر سے یہ بھی دیکھ ڈالئے کہ یہ امت اپنی اس ذمے داری کو پورا کس طرح کر رہی ہے؟ دماغ کو تمام خارجی تاثرات سے آزاد کر کے ''مَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ'' پر اول سے آخر تک نظر ڈال جایئے اور اس کے بعد امت کے پورے عملی رویے کا گہرا جائزہ لیجیے۔ پھر اندازہ کیجیے کہ قرآن کے احکام پر عمل ہو رہا ہے؟ چھوڑ دیجیے ان لوگوں کو جو ''مسلمان'' ہوتے ہوئے بھی اسلام کے علانیہ باغی اور اس کے اصولوں کی سچائی کے منکر ہیں۔ یا جن کی زندگی کے لمحات ایک ایک کر کے اسلامی قوانین کے توڑنے بلکہ مٹانے ہی میں صرف ہوتے رہتے ہیں اور جن کو فقہی اصطلاح میں فاسق و فاجر کہا جاتا ہے۔ ان افراد اور حلقوں کی طرف نگاہ دوڑایئے جو نیکی اور تقویٰ اور ایمان و عمل کے لحاظ سے اگلی صفوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہاں بھی آپ کو جو کچھ دکھائی دے سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ان احکام الٰہی سے جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے وہ غفلت نہیں برتتے، نمازوں اور روزوں کی پوری پوری پابندی ہوتی ہے اور وظائف کی کثرت ہے، زکوٰۃ وصدقات ادا ہو رہے ہیں۔ جھوٹ، غیبت، بدگوئی اور بہتان تراشی سے زبان آلودہ ہونے نہیں پاتی۔ کبر و غرور، نمود و ریا، خیانت و بدعہدی، ظلم اور رشوت غصب اور حرام خوری، اور فتنہ و فساد کے دھبوں سے ان کے ایمان کا دامن پاک رہتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جہاں تک دین کے اجتماعی احکام و مسائل کا تعلق ہے ان سے غفلت و بے اعتنائی کا حال ان حلقوں میں بھی وہی ہے جو غیر متقی حلقوں میں نظر آتا ہے۔ قرآن نے اگر زندگی کے صرف انفرادی پہلو سے ہی بحث کی ہوتی تب تو بلاشبہ اس طرح اتباعِ قرآن کا حق ادا ہو جاتا مگر وہ تو زندگی کے اجتماعی مسائل کو بھی اتنی ہی اہمیت کے ساتھ لیتا ہے جتنی اہمیت سے

کہ اس نے انفرادی مسائل کو لیا ہے۔ اس نے نماز' روزے' حج اور زکوٰۃ کے فرائض ادا کرنے اور دیانت' امانت' راست گوئی' اخلاص' وفائے عہد' حسنِ سلوک' اکلِ حلال وغیرہ اخلاقِ فاضلہ پر کاربند ہونے کی ہدایتیں دینے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق اور آقائی وفرمانروائی کا مستحق نہیں۔ اس لیے اسی کو اپنا معبود، آقا اور سلطان مانو (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) (اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط) (یوسف 40:12) اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (الاعراف 54:7) خدا ہی کی بندگی کرو اور تمام باطل معبودوں کو چھوڑ دو۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (النحل 36:16) خدائی اور فرمانروائی کے ان تمام جھوٹے مدعیوں کے دعوے تسلیم کرنے سے انکار کردو' جو خدا کی بادشاہت سے باغی ہو کر اس کی رعایا پر اپنا حکم چلانا چاہتے ہیں۔ (وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ ط (نساء 60:4) ان لوگوں کا کہنا نہ مانو جو اللہ کے حقوق سے غافل اور اس کی حدود کو توڑنے والے ہیں۔ وَلَا تُطِیْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ ہ الشعراء 151:26 جب فیصلہ کرو تو احکام الٰہی کے مطابق کرو۔ وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (المائدہ 49:5) جب اپنا فیصلہ کراؤ تو انھی احکام کے تحت کام کرنے والی عدالتوں سے کراؤ۔ ورنہ غیر الٰہی قوانین کی عدالت میں اپنا معاملہ لے جانے والا منافق ہے۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ (النساء 60:4) اور قوانینِ الٰہی کو چھوڑ کر ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والا' ظالم' فاسق اور کافر ہے: وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ...... الظّٰلِمُوْنَ...... الْفٰسِقُوْنَ المائدہ 5:47-44 کسی برائی اور کسی ظلم کے پروان چڑھانے میں کسی طرح کا تعاون نہ کرو۔ (وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ص) (المائدہ 2:5) کفر کے علم برداروں سے لڑو' یہاں تک کہ کفر کا علم سرنگوں ہو جائے اور اللہ ہی کی اطاعت رہ جائے۔ (وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ ط) (البقرہ 193:2) .... جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑے اس سے خدا کی زمین پر زندہ رہنے کا حق چھین لو۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا (المائدہ 33:5) جو چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو۔ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ

فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا (المائدہ 38:5) جو بدکاری کرے اس کو سو کوڑوں کی سزا دو۔ (اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ) (النور 2:24) جو کوئی کسی پاک دامن پر زنا کا جھوٹا الزام لگائے اس کو اسی (۸۰) دُرّے لگاؤ (وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً (النور 4:24) جو کوئی کسی کو عمداً قتل کر دے اس کی بھی گردن اڑا دو۔ (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ط اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (البقرہ 178:2) غرض یہ اور انھی جیسے بے شمار احکام شریعت ایسے بھی ہیں جو ہماری انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر ہماری اجتماعی زندگی کو بھی اپنا پابند بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور یہ سب کے سب اُسی قرآن میں موجود ہیں، جس میں نماز روزے کے احکام درج ہیں۔ اس لیے جب تک ان احکام پر بھی عمل نہ کرلیا جائے یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اتباعِ دین اور عمل بالقرآن کا حق ادا ہو رہا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اس جماعت کے لیے جس نے اللہ کی کتاب پر پورا پورا عمل کرنے کا عہد کیا ہے یہ سارے احکام بھی بالیقین اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح وہ دوسری قسم کے احکام، بلکہ امرِ واقعی تو یہ ہے کہ اپنی بھاری اہمیتوں کی بنا پر ان میں سے اکثر احکام ایسے ہیں جو مدار ایمان اور شرط نجات ہیں۔ اس لیے وہ ایک مسلمان کے لیے اولین توجہ کے مستحق ہیں۔ لیکن ''خالص دینی اور متقی حلقوں'' میں بھی ان پر عمل کا سراغ ملنا تو درکنار، عمل کی خواہش کا وجود بھی تقریباً نایاب سا ہے۔ آج ہمارا معبود اور شہنشاہ اللہ تعالیٰ ضرور ہے مگر مسجد کی چار دیواریاں اس کی معبودیت اور شہنشاہیت کی آخری حدیں ہیں اور مسجد سے باہر ہمارے آقا و حکمران وہ لوگ ہیں جو ہماری ہی طرح مخلوق ہیں۔ اور خود بھی اسی ایک آقا کی غلامی اور اسی ایک حاکم حقیقی کے قانون کی پیروی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو اللہ و رسولؐ کے علانیہ باغی اور کفر و ضلال کے امام ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو مسلمان ہیں، لیکن ایسے مسلمان جنھوں نے اللہ کے ان حقوقِ فرمانروائی کو جن کا تعلق دنیا میں انسانوں کی اختیاری زندگی سے ہے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ قریب قریب پوری امت مسلمہ انھی دو قسم کے

''اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ'' کو اپنا صاحب امر و حکم بنائے ہوئے ہے۔ اب اس کے لیے قانون وہ ہے جو یہ خداوندانِ ارضی نافذ کریں۔ نہ کہ وہ جو کتاب و سنت میں ہے، پھر جب انسانی زندگی کے ایسے بنیادی مسئلے میں اس امت نے پہلے مداہنت کی اور بالآخر تعاون کی پالیسی اختیار کر لی اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے ہاتھوں میں اپنے نظام سیاست کی باگیں دے کر انھی کو اپنا صاحب امر تسلیم کر لیا تو اس کے وہ بہت سے مسائل زندگی جن کا تعلق براہِ راست حکومت سے ہوا کرتا ہے آپ سے آپ غیر اسلامی بنیادوں پر طے ہونے لگے۔ اب اس کے کتنے ہی اصولِ زندگی..........اس کے سیاسی نظریات‘ اس کے معاشی تصورات اور اس کے عمرانی افکار کی بنیاد ہی بدل گئی اور اس کی زندگی کا پورا ڈھانچہ اور مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کا طرز ہی کچھ اور ہو گیا۔ اب وہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی غیر منقسم حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت کی داعی اور علم بردار ہے۔ اب وہ اس نظام زندگی کو‘ جو اپنے اصول و فروع میں سرتاپا غیر اسلامی‘ غیر قرآنی بلکہ کافرانہ ہے نہ صرف انگیز کر رہی ہے بلکہ اس کی مشین چلانے میں مسابقت دکھا رہی ہے۔ اس کے افراد نہایت اطمینان کے ساتھ اللہ کے نازل کردہ قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ کرتے اور کراتے ہیں۔ حالانکہ انھیں علم ہے کہ اس معاملے میں اللہ کا حکم یہ نہیں ہے۔ اب ارتداد‘ چوری‘ زنا‘ بہتان اور قتل کے جرائم کی سزائیں کہیں بھی وہ نہیں دی جاتیں جو کتاب و سنت میں مقرر ہیں حالانکہ انھوں نے اپنے فرمانروائے حقیقی سے عہد کیا تھا اور وفاداری کا حلف اٹھایا تھا کہ ہم ان تعزیرات کو جاری کریں گے۔ اس طرح قرآن کا ایک بڑا حصہ صرف کتابت اور تلاوت کے لیے محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے ماننے والوں کی عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اگر ہمارے اندر قرآنی تعلیمات کا سچا فہم اور اسلام کی صحیح بصیرت موجود ہو‘ اور نفس کی چالبازیوں نے ہماری روحِ ایمانی کو تھپکیاں دے کر سلا نہ دیا ہو تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ قرآن کے ساتھ ہم بڑی حد تک وہی سلوک کر رہے ہیں جو اہلِ کتاب نے توراۃ اور انجیل کے ساتھ کیا تھا۔ البتہ قرآن اللہ تعالیٰ کا چونکہ

آخری ہدایت نامہ تھا جس کے باعث اس نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ کر رکھا ہے اس لیے یہ تو ممکن نہیں کہ گزشتہ آسمانی کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی لفظوں کا رد و بدل اور عبارتوں کی کاٹ چھانٹ کی کوئی جسارت کامیاب ہو سکے۔ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی ظلم اور خیانت ایسی نہیں ہے جو دوسری امتوں نے اپنے صحیفوں کے ساتھ روا رکھی ہو اور مسلمان اس سے باز رہے ہوں۔ عملی طور پر انھوں نے قرآن کے ایک حصے کو فراموش کر رکھا ہے۔ مراحلِ زندگی میں اس کو آگے رکھنے کے بجائے پیٹھ پیچھے رکھ چھوڑا ہے "اور کچھ اقرار اور کچھ انکار" کی روش پر پورے اطمینان کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ قدرت اَفَتُؤمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کا الزام ایک محدود معنی ہی میں سہی ان پر عائد نہ کرے اور پھر خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا کی اس پاداش کا انھیں مستحق نہ ٹھیرائے جس کا اس کا قانون مطالبہ کرتا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆